باب 11

ریٹائرمنٹ کے بعد سیاسی اور سماجی سرگرمیاں

آزاد کشمیر کی سیاسی زبوں حالی

ریاست جموں و کشمیر کے علاقوں میں آزاد کشمیر کے پاس صوبہ کشمیر میں ضلع مظفر آباد کا حصہ، صوبہ جموں میں پونچھ اور میرپور کا کچھ حصہ ہے۔ یہ دونوں حصے بلترتیب ضلع ہزارہ اور پوٹھوہار کا ہی حصہ ہیں جن کی تہذیب، زبان، کھانا پینا، رسم و رواج ان جیسے ہی ہیں۔ شادی بیاہ اور روزگار بھی ان ہی علاقوں سے منسلک ہے بھی اور رہتا بھی ہے۔ گلگت بلتستان شروع سے ہی الگ حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں لداخ اور کارگل کا علاقہ بھی شامل تھا جو اَب ہندوستانی کشمیر کا حصہ ہیں۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کا علاقہ قیامِ پاکستان کے دن سے ہی حکومت پاکستان کے زیر تسلط رہا اور اس میں بالواسطہ اور بلاواسطہ حکومت پاکستان ہی حکومت کرتی رہی لیکن اس کو نام آزاد کشمیر کا دیا گیا ہے۔ گلگت بلتستان کبھی بھی آزاد کشمیر کے ساتھ منسلک نہیں رہا کیوں کہ گلگت کی آزادی کے دن سے ہی اس پر افواجِ پاکستان کے لوگوں کی حکومت تھی جن کے روحِ رواں کرنل حسن اور انگریز میجر براؤن تھے جو یقینی طور اس علاقے

191

میں پاکستانی فوج کا حصہ تھے۔ اس کے بعد حکومت پاکستان نے نومبر 1947 میں وہاں محمد اسلم نامی ایک شخص کو ناظم مقرر کر کے بھیجا۔ سلامتی کونسل اور اس کے مقرر کردہ کمیشن کی قراردادوں کے بعد آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقوں کو پوری ریاست کا حصہ قرار دے کر متنازع اور حل طلب قرار دیا گیا۔ 24 اکتوبر 1947 کے اعلامیہ کے مطابق آزاد کشمیر حکومت ایک خودمختار حکومت کے طور قائم کی گئی تھی جبکہ گلگت بلتستان براہ راست حکومت پاکستان کے پاس آیا۔ بعد ازاں سلامتی کونسل کی قراردادوں کے تحت پوری ریاست کے ساتھ ساتھ ان علاقوں (گلگت بلتستان) کو متنازع قرار دیا گیا۔ یکم جنوری 1949 کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بندی معاہدے کے بعد 24 اکتوبر کی حکومت کی حیثیت بھی تبدیل ہوگئی اور عملاً گلگت بلتستان کو بھی پاکستان میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ حالاں کہ وہاں کے مقامی میروں اور راجوں نے پاکستان کے ساتھ تحریری طور پر الحاق بھی کیا ہے۔ اس حکمت عملی کے طور پر آزاد کشمیر حکومت (یہاں کی حکمران جماعت مسلم کانفرنس) اور حکومت پاکستان کا بذریعہ وزارتِ امورِ کشمیر 28 اپریل 1949 ایک معاہدہ ہوا، جس کو معاہدۂ کراچی کہتے ہیں۔ اس معاہدے کی رُو سے گلگت بلتستان کے علاقے کا نظم و نسق حکومت پاکستان کے پاس رہنے پر اتفاق ہوا۔ یہ محض کاغذی کارروائی تھی، وگرنہ گلگت بلتستان کے علاقے پہلے سے حکومت پاکستان کے کنٹرول میں تھے۔

ان علاقوں میں حکومت کی کوئی نمائندہ شکل نہیں تھی جبکہ آزاد کشمیر میں حکومت پاکستان کی منظور شدہ مسلم کانفرنس کا نامزد شخص صدر مقرر کیا جاتا تھا۔ بیوروکریسی کے سربراہ حکومت پاکستان کے نمائندے ہی ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ اب عوام سے ووٹ حاصل کر کے منتخب ہونے والے نمائندے، حکومت پاکستان یا پاکستانی حکمران پارٹی کے نامزد شخص کو رسمی کارروائی کے بعد صدر اور وزیر اعظم منتخب کرتے ہیں۔ مرکزی نوعیت کے تمام امور براہِ راست اور بالواسطہ کشمیر کونسل کے نام پر حکومت پاکستان کے قانونی اور انتظامی کنٹرول میں ہیں، جبکہ باقی ماندہ امورِ حکومت آزاد کشمیر کے نام منسوب ہیں۔ جبکہ ان کے انتظامی اور مالی سربراہ بھی حکومت پاکستان کی

بیوروکریسی ہے جن میں چیف سیکریٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ایڈیشنل چیف سیکریٹری ترقیاتی، سیکریٹری مالیات، آڈیٹر جنرل اور اکاؤنٹنٹ جنرل ہیں۔

آزاد کشمیر میں زلزلہ کے بعد سارے ترقیاتی منصوبے حکومت پاکستان کے محکمہ (ERRA) Earthquake Reconstruction and Rehabilitation Authority کے زیر کنٹرول ہیں جس میں سب لوگ حکومت پاکستان کے تعینات شدہ ہیں۔ اس سے متعلق قانون بھی حکومت پاکستان نے بنایا جس کا اطلاق براہِ راست آزاد کشمیر پر کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کو باقی صوبوں کے ساتھ شامل کر کے کوئی قانون نہیں بنایا۔ آزاد کشمیر کے کسی ادارے کا حکومت پاکستان سے متعلق کسی ادارے یا شخص پر کوئی کنٹرول نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ کسی کے پاس جواب دہ ہیں۔ اس وجہ سے انتظامی اور مالی لحاظ سے ان اداروں کی کرپشن کو کنٹرول کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

میں صرف ایک مثال کے ذریعہ صورتِ حال واضح کروں گا کہ پارلیمنٹ پاکستان کی ایک کمیٹی نے آزاد کشمیر کونسل سیکریٹریٹ کو کوئی ریکارڈ پیش کرنے کے لیے کہا جس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں ہے، اس لیے کونسل پارلیمنٹ آف پاکستان کے پاس جواب دہ نہیں ہے جبکہ آزاد کشمیر اسمبلی اور اس کے احتساب بیورو کی کمیٹیوں کے نوٹس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ کونسل وفاقی حکومت کا ادارہ ہے جو آزاد کشمیر کے کسی ادارے کے پاس جواب دہ نہیں ہے۔ میں ان دونوں ٹیکنیکل جوابات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لوگ آخر کس کے پاس جواب دہ ہیں؟ آزادی اور انفارمیشن کے اس زمانے میں کیا یہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکیں گے اور آزاد کشمیر کو چراگاہ سمجھ کر، بلا جواب دہی کے خوف کے، جہاں سے چاہیں چرتے رہیں گے؟ یہ ان علاقوں کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔

آئینی اور قانونی اعتبار سے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان، پاکستان کے صوبے نہیں لیکن انتظامی حصے ضرور ہیں۔ سلامتی کونسل کی قرار دادوں کے تابع 1949 کے جنگ بندی معاہدہ کے

بعد، ریاست کے منقسم حصے ہندوستان اور پاکستان کے کنٹرول میں دیئے گئے ہیں۔[191] اس کی نگرانی کے لیے یو این ملٹری کے آبزرور مقرر کیے گئے ہیں۔ تاشقند اور شملہ معاہدہ میں اس صورتِ حال کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے درمیان مفاہمت CBMS کے تحت بھی یہی صورتِ حال مسلمہ ہے۔ حال ہی میں لائن آف کنٹرل کے ذریعہ تجارت اور لوکل پرمٹ کے ذریعہ سفر کو دونوں حکومتوں کی فوج اور ایجنسیاں کنٹرول کرتی ہیں۔ پاکستان کے آئین کی دفعہ 1((d) (2 کے مطابق ایسے علاقے یا ریاستیں (which are otherwise included in Pakistan) پاکستان کی سرزمین کی تعریف میں آتے ہیں۔ اگرچہ یہ انتظام عبوری، عارضی اور تابع حتمی فیصلہ ریاست ہے، لیکن حقیقت یہی ہے۔ اس کے باوجود، کوئی یہ کہے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان پاکستان کا حصہ نہیں ہیں، تو یہ خود کو بے وقوف بنانے کے مترادف ہے۔ پاکستان کی حکومت کے علاوہ وہاں کی تمام سیاسی جماعتیں آزاد کشمیر میں ہر قسم کی سیاسی سرگرمیاں کرتی ہیں۔ آزاد کشمیر کے آئین کے تحت یہاں کے لوگوں کو سوائے پاکستان کے کوئی اور Option نہیں ہے کیوں کہ آئین میں لکھا ہے کہ

" No person or political party in Azad Jammu Kashmir shall be permitted to propogate against, or take part in activities prejudicial or detrimental to the ideology of the states accession to Pakistan consitution." (4)(7)(2)

اپنے جذبات یا نظریات کی تسکین کے لیے مختلف سیاسی جماعتیں جو مرضی ہے اس صورت حال کو بیان کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ جب تک پوری ریاست جموں و کشمیر کا سلامتی کونسل کی قرار دادوں کے مطابق فیصلہ نہیں ہوجاتا ریاست کے پاکستان کنٹرول کے اندر علاقے پاکستان کا حصہ ہیں۔ حکومت پاکستان کے 11 مئی 1971 اور 6 مئی 1988 کے نوٹیفکیشنز کے مطابق آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ سردار عبدالقیوم اور مسلم کانفرنس کی حکومت کے دور میں ہوا جو سب سے زیادہ شور مچاتے ہیں کہ آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ یا صوبہ نہیں ہے۔ اپنے اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی خاطر سیاسی جماعتیں وقتاً فوقتاً مختلف روپ دھار لیتی ہیں۔ اقتدار کے اندر لوگ باہر والوں کو پاکستان

دشمن اور باہر کے لوگ اندر والوں کو قوم فروش اور وطن فروش کہتے ہیں، حالاں کہ دونوں ایک جیسے ہیں، جگہ اور مقام بدلنے سے الفاظ بدل لیتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر پاکستان کے قومی اور آئینی دھارے میں آزاد کشمیر اور یہاں کے لوگوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ محض طفیلی کے طور پر زندہ باد اور مردہ باد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر کئی ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا جہاں میں نے اپنی بے حد تذلیل محسوس کی اور افسوس ہوا کہ اگر مجھے کشمیر سے ترکِ سکونت کرنا ہی تھی تو آزاد کشمیر کی بجائے پاکستان کے کسی دوسرے حصے، اسلام آباد یا لاہور اور ایبٹ آباد میں کیوں آباد نہیں ہوا؟ لیکن اس وقت مجھے اس کی آئینی اور سیاسی حیثیت کا ادراک نہیں تھا۔ ہندوستانی کشمیر کے لوگ 1990 تک آزاد کشمیر کو پاکستان کا ایک صوبہ سمجھتے تھے۔ کسی کے وہم وگمان میں یہ بات نہیں تھی کہ آزاد کشمیر، پاکستان کا آئینی حصہ نہیں۔ میرے ساتھ ہونے والے کئی واقعات نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

میں نے جب پاکستانی پاسپورٹ حاصل کیا تو اس کے نیشنلٹی والے کالم میں لکھا گیا تھا

"Native of Former State of Jammu & Kashmir"

ہندوستانی سفارت خانے میں جب میں نے یہ پاسپورٹ ویزہ کے لیے دیا، انہوں نے کہا یہ کوئی نیشنلٹی نہیں ہے، اس لیے ویزہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس میرے ہی کچھ دوستوں اور رشتہ داروں نے جو ریاستی باشندہ ہیں اور ان کے پاسپورٹ پر نیشنلٹی پاکستانی لکھی تھی، ان کو ویزا مل گیا۔ اس کے بعد میں نے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر کے پاکستانی نیشنلٹی والا پاسپورٹ حاصل کیا۔ البتہ اس کے بعد کسی کے پاسپورٹ پر یہ سٹیمپ نہیں ڈالی جاتی۔ صحیح آئینی اور قانونی صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستانی باشندہ کی تعریف میں وہ لوگ آتے ہیں جو ان علاقوں میں رہتے ہوں جو پاکستان کے آئین کی دفعہ 1 میں درج ہیں۔ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے علاقے اس دفعہ میں درج نہیں ہیں، اس لیے حتمی طور پر یہاں کے لوگ پاکستانی باشندے نہیں۔ یہ پاکستان کا حصہ نہیں تو کس کا حصہ ہیں؟ اور پاکستان کی یہاں کیا آئینی حیثیت ہے؟ قومی سلامتی کے اداروں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ جبکہ شاطر

سیاست دان اس مبہم صورتِ حال سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ پاکستان کی شہریت[191] کے 1952 کے قانون کے تحت ریاست کے ان باشندوں کو پاکستانی شہری قرار دیا گیا ہے جو پاکستان کے علاقوں میں پاکستانی پاسپورٹ پر آباد ہیں۔

پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے آزاد علاقے کے لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟ اس صورتِ حال کا ادراک کر کے پاکستان کے آئین میں ان علاقوں کے لیے خصوصی انتظام کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ ہندوستان نے اپنے آئین کے تحت پوری ریاست کو اپنا حصہ قرار دیا ہے لیکن چند دفعات کے تحت پاکستان کے زیر انتظام علاقوں کو اس سے نکالا ہوا ہے۔ جبکہ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے 1994 اور 2013 کی قراردادوں کے تحت ان کو اپنا علاقہ قرار دے کر نہ صرف ان کی واپسی کا تقاضا کیا ہے بلکہ سیاچن اور کارگل کی چوٹیوں پر اس بنا پر قبضہ جمایا ہے۔ پاکستان کے قومی سلامتی کے ادارے اس پر کیوں خاموش ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کشمیر کے جو باشندے باقی صوبوں میں آباد ہیں یا آزاد کشمیر کے جو لوگ مرکزی حکومت کے کوٹے سسٹم کے تحت ہر مرکزی ادارے میں ملازم ہیں، ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعصب یا امتیاز نہیں برتا جاتا بلکہ اپنے اپنے شعبہ کی اعلیٰ ترین منزل پر بھی متمکن ہوتے ہیں، لیکن یہ اس ناانصافی کا مداوا نہیں جو اس علاقے کے ساتھ مجموعی طور پر ہوتی جا رہی ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کو سرکاری گرین پاسپورٹ حاصل کرنے کا استحقاق حاصل ہے۔ جب میں نے بطور جج اس کے لیے درخواست دی، مجھے یہ پاسپورٹ دینے سے اس لیے انکار کیا گیا کہ آزاد کشمیر کے جج پاکستانی نہیں ہیں۔ اس پر بھی میں نے لاہور ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ میں رٹ کے ذریعہ فیصلہ کروا کر یہ پاسپورٹ حاصل کیا۔ اگرچہ بیرون ملک پاکستان کے ہر قسم کی کیٹگری کے پاسپورٹ والے کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک ہوتا ہے مگر ملک کے اندر تو ایسا نہیں ہونا چاہیے!! میں نے سنا ہے کہ آزاد کشمیر کے جو ملازم پاکستان کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس کے ذریعہ بیرون ملک دوروں پر جاتے ہیں، ان کو باقی پاکستانی ساتھیوں کے برعکس عام پاسپورٹ دیا

جاتا ہے جبکہ باقی ہمسفروں کو سرکاری۔

تیسرا واقعہ: ایئر پورٹ کے اندر ایک خصوصی انتظار گاہ ہوتی ہے جس کو (وی آئی پی لاؤنج) کہتے ہیں جس کے لیے محکمہ دفاع، اعلیٰ عدلیہ کے ججوں نیشنل اسمبلی کے ممبروں وغیرہ کو خصوصی پرمٹ جاری کرتا ہے۔ جب میں نے اس کے لیے خط بھیجا تو اسی وجہ سے انکار کیا گیا کہ آزاد کشمیر کے جج پاکستان کے جج نہیں ہیں۔ اس کے خلاف میں نے سپریم کورٹ پاکستان میں درخواست دی جس کی مداخلت کے بعد پرمٹ جاری کیا گیا۔ یہ بے توقیری ہمارے بچے نہیں مانیں گے، ہماری کمٹمنٹ کی وجہ سے مجبوری ہے۔

یہ تو قانونی معاملات کا حال ہے۔ ذاتی طور پر بھی میں نے امتیازی برتاؤ محسوس کیا مثلاً، سپریم کورٹ پاکستان میں 2005 میں ایک جیوڈیشل کانفرنس میں آزاد کشمیر کے ججوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ ایک فنکشن کنونشن ہال اسلام آباد میں ہونا تھا، جس سے صدر پاکستان جنرل مشرف نے خطاب کرنا تھا اس کے لیے خصوصی پاس جاری کیے گئے تھے۔ لیکن ہمیں نہ تو پاس جاری کیا گیا اور نہ ہی اندر جانے دیا گیا۔ اس کانفرنس میں آزاد کشمیر کے ججوں کو پاکستان کے ریٹائرڈ ججوں کے ساتھ بٹھایا گیا۔

اس عرصہ کے دوران کنونشن سینٹر میں ایک کشمیر کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس میں کشمیر سے میر واعظ عمر فاروق، پروفیسر عبدالغنی بھٹ وغیرہ بھی شامل تھے۔ مجھے بھی وائس چانسلر آزاد کشمیر یونیورسٹی کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی۔ وزیر اعظم شوکت عزیز نے کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں وزیر اعظم ہاؤس میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا تھا۔ باقی شرکاء کے ساتھ میں بھی وہاں گیا لیکن دعوت کے شروع ہوتے ہی چند اہلکاروں نے کہا کہ آپ کا نام لسٹ میں درج نہیں ہے، ہم معذرت خواہ ہیں۔ میں پلیٹ چھوڑ کر واپس نکل آیا۔

جنرل مشرف کے زمانے میں آرمی ہاؤس راولپنڈی میں چیف جسٹس آف پاکستان کے حلف میں مجھے بھی چیف جسٹس ہائی کورٹ کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی۔ جب میں اندر داخل ہوا میرے آگے چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ کی گاڑی تھی، جو سیدھی چلی گئی لیکن مجھے کم از کم دس منٹ

روک کر گاڑی کی تلاشی لی گئی۔ ہمارے کوائف لیے گئے، پھر اندر جانے دیا گیا۔[191]

چیف جسٹس پاکستان افتخار محمد چوہدری کی جب راولپنڈی ہائی کورٹ بار میں معزولی کے بعد پہلی وکلاء کی تقریب ہوئی، اس میں پاکستان بھر کے ججوں کو دعوت دی گئی تھی لیکن صرف میں شریک ہوا۔ وہاں مجھے عام لوگوں میں بٹھایا گیا لیکن پھر چند کشمیری نژاد وکلاء کے شور کرنے پر سٹیج پر لیا گیا۔ اس تقریب میں گوجرخان کی ایک سول جج خاتون بھی شامل تھی۔ اعتزاز احسن جو اس تحریک کے روحِ رواں تھے اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے صفِ اوّل کے شخص ہیں، انہوں نے میری موجودگی کو Acknowledge کرنے کی بجائے سول جج پنجاب کو خراج عقیدت پیش کر کے کہا کہ ''یہ بارش کا پہلا قطرہ ہے۔''

میں نے جب سپریم کورٹ پاکستان میں میرے ساتھ ہونے والی نا انصافی کے خلاف پٹیشن دائر کرنے کے لیے حامد خان ایڈووکیٹ سے رابطہ کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ اس کی وجہ سے پاکستان کو ہندوستان بدنام کرے گا، جیسا کہ میرے ساتھ ہونے والا لاعمل نیک نامی کا باعث تھا؟ طلعت حسین ٹی وی اینکر نے سرینہ ہوٹل میں ملاقات کی، تو پوچھا کہ آپ کے کیس کے ساتھ ہمارے پاکستانی لوگوں کا کیا تعلق ہے؟ جیسا کہ آزاد کشمیر میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس سے پاکستان لاتعلق ہے!!

پاکستان کے قومی میڈیا کی آزاد کشمیر کے حوالہ سے یہی پالیسی ہے جس کی کسی صوبے کے گاؤں کے برابر بھی حیثیت نہیں ہے۔ یہ محض ہمارے قومی دھارے میں نہ ہونے کی وجہ سے ہے جس کے ذمہ دار ہمارے اپنے لوگ ہیں، پاکستانی لیڈر شپ نہیں۔ جنرل مشرف کے زمانے میں جی او سی مری، آزاد کشمیر کی کیبنٹ اور حکومت کی میٹنگز کی صدارت کرتا تھا۔ صدر اور وزیر اعظم کو مری میں بلا کر ہدایات دی جاتی تھیں۔ آزاد کشمیر میں ممبران اسمبلی وغیرہ کو اس وقت تک سرکاری پاسپورٹ نہیں مل رہا حالاں کہ ان کے ہم پلہ پاکستانی صوبوں کے لوگوں کو یہ تمام مراعات حاصل ہیں۔ یہاں کے حکمرانوں سے کوئی مرکزی سیکریٹری کئی کئی دن ملتا بھی نہیں۔ آزاد کشمیر میں تعینات مرکزی عہدیدار جن کو مقامی زبان میں Lent Officer کہتے ہیں، بھی ان کی نہیں مانتے وغیرہ وغیرہ۔ مرکزی قومی اداروں فنانس

کمیشن، نیشنل اکانومک کونسل، کونسل آف کامن انٹرسٹ، پانی کی تقسیم کی کونسل کے فیصلے سب سے زیادہ آزادکشمیر کو متاثر کرتے ہیں، لیکن اس میں آزادکشمیر کی نمائندگی نہیں ہے۔ میں 2015 میں پاکستان اسلامی نظریاتی کونسل کا ممبر بنا، اس سے پہلے آزادکشمیر سے کوئی شخص ممبر نہیں بنا تھا، کونسل کے سارے ممبران بشمول انتظامیہ کا میرے ساتھ رویہ ایسا ہے جیسے کہ میں کوئی اجنبی اور اس سسٹم میں Misfit ہوں۔

آزادکشمیر کی حکومت کی اندرونی خودمختاری اسمبلی میں مہاجرین مقیم پاکستان کی بارہ نشستوں، حکومت پاکستان، منسٹری کشمیر افیئرز، کشمیر کونسل، لینٹ آفیسروں اور مقامی ایجنسیوں، کی یرغمال ہے۔ آزادکشمیر میں پاکستانی سیاسی جماعتوں اور منتخب ہونے والے حکمرانوں نے بھی سوائے الیکشن مہم کے، کبھی بااختیار ہونے کی کوشش نہیں کی، اور اگر کسی نے کی، اس کو رول بیک ہونا پڑا۔

کشمیر کے جو لوگ پاکستان کے اندر آباد ہیں، ان کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ یہاں کے لوگوں کی پاکستانی فوجی سروسز، فارن سروس، ایڈمنسٹریٹو سروس حتیٰ کہ سیاسی زندگی میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ فوج میں کئی جنرلز، سفارت کار، فیڈرل سیکریٹریز، اعلیٰ سرمایہ کار، سیاسی زندگی میں منسٹر، سپیکر، چیئرمین سینٹ، ممبران نیشنل اسمبلی سینٹ وغیرہ ہیں۔ آزادکشمیر کے اندر سیاستدانوں کو گداگری کی عادت پڑ گئی ہے کیوں کہ یہ چاپلوسی اور رشوت کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا آسان سمجھتے ہیں۔ جبکہ قومی دھارے میں آنے کی صورت میں پارلیمنٹ کے ممبران، سیاسی جماعتوں کے سربراہ بھی شامل ہو جائیں گے، جن کی موجودگی میں پس پردہ ہاتھوں کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا مشکل ہو گا۔ اس ساری غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر انسانی مشق کا نقصان مملکت پاکستان اور آزادکشمیر کو ہو رہا ہے جبکہ فائدہ صرف دو تین لوگوں کا ہے۔ نہ معلوم ادارے اس کا ادراک کیوں نہیں کرتے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر واعظ یوسف شاہ مرحوم، سردار ابراہیم خان مرحوم، کے ایچ خورشید مرحوم اور سردار عبدالقیوم خان کی ذاتی قد کاٹھ کی وجہ سے آزادکشمیر کی بھی کافی عزت تھی۔ لیکن بوجوہ سردار عبدالقیوم خان مرحوم کا وقار آخری ایام میں نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔ سکندر حیات خان نے اندرون آزادکشمیر مکمل کنٹرول رکھا، لیکن مشرف کے زمانے میں محض نوکری اور برائے نام ہی رہے۔ یہ

سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک ان علاقوں کا پاکستان کی حکومت[191] کے ساتھ کوئی آئینی تعلق پیدا نہیں کیا جاتا اور آزادکشمیر کے لوگ پاکستان کی حکومت بنانے یا ہٹانے میں حصہ دار نہیں بنتے۔

اس میں حکومت پاکستان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہاں کے مقامی لوگوں اور لیڈروں کا قصور ہے جو چاپلوسی اور پاکستان حکومت کے غلام بن کر آزادکشمیر کے عام لوگوں پر حکومت اور لوٹ کھسوٹ کرنے کے لیے آزادکشمیر کو پاکستان آئینی دھارے میں مقام نہیں دلانے دیتے اور اس کا عذر یہ دیتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ متاثر ہو جائے گا۔ جبکہ کشمیر کا مسئلہ ان لوگوں یا ان کی حکومت کی وجہ سے نہیں بلکہ حکومت پاکستان کے مضبوط یا کمزور ہونے سے وابستہ ہے۔ ہندوستان پوری ریاست کو اپنا آئینی حصہ کہتا ہے اور مقبوضہ کشمیر اس کے فوجی قبضہ میں ہے، اس کے باوجود کشمیر کا مسئلہ متاثر نہیں ہوا۔ آزادکشمیر اور گلگت بلتستان کو پاکستان اپنا حصہ نہیں سمجھتا، لیکن کون مانتا ہے کہ یہ آزاد ہیں یا ہم کس کا معنی پیش ہیں؟ اس بے توقیری میں ان ریاستی باشندوں کا بھی گہرا ہاتھ ہے جو پاکستان کے باقی صوبوں میں آباد ہیں، وہاں کے ڈومیسائل رکھتے ہیں، وہاں مقامی اور قومی اسمبلی کے ممبر اور منتخب ممبران کے ووٹر ہیں۔ مرکزی حکومت سازی میں حصہ لیتے ہیں لیکن ٹانگ آزادکشمیر میں بھی اٹکائی ہوئی ہے اور پاکستان کے پالیسی سازوں اور حکمرانوں، جن پر ان کا اثر ہے، کے ذریعہ آزادکشمیر کو قومی سطح پر مقام دلانے میں مخل ہیں کہ اس سے کشمیر کا مسئلہ متاثر ہو گا جبکہ خود صوبائی، قومی اور لوکل اتھارٹیز کے ووٹر اور ممبر ہیں۔ اس طرح ریاست کے وہ باشندے جو بیرون ملک کشمیر کے متنازع ہونے اور ہندوستان پاکستان کی حکومتوں کی ظلم و زیادتی کی اصلی یا فرضی داستانوں کے ساتھ پناہ گیر ہوتے ہیں (Asylum میں)، دنیا کے مختلف اداروں سے مختلف ناموں پر آزادی کی تحریکیں چلانے کے نام پر مدد حاصل کرتے ہیں، بھی آزادکشمیر کے لوگوں کے پاکستان میں آئینی مقام حاصل کرنے کے خلاف ہیں۔ اگر ان لوگوں کو کشمیر سے اتنی ہی محبت ہے تو ہمارے ساتھ سردی، گرمی، اچھائی، برائی میں شامل ہو کر تحریک چلائیں۔ اپنے لیے آزاد اور خودمختار ملکوں میں سب حقوق حاصل کیے ہیں لیکن آزادکشمیر کے لوگوں کو مملکت پاکستان کے کنٹرول میں ہونے کے باوجود بے توقیر بنائے رکھا ہے۔

مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آسکی کہ ان علاقے کے لوگوں کو حقوق سے محروم رکھ کر ہندوستانی کشمیر کی آزادی کی بات کیسے کی جارہی ہے؟ جو لوگ یہاں موجود ہیں، ان کے مقام کا باوقار تعین کر کے ان علاقوں کا مقدمہ لڑیں تو اس میں وزن ہوگا جو خود بھی ہندوستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے جبکہ جو رہنا چاہتے ہیں، ان کو ان کے نام پر حقوق سے محروم رکھا جارہا ہے۔ چہ بوالعجبی است؟ ہندوستان کے زیر قبضہ کشمیر میں خودمختاری کی تحریک 1990 کے بعد اس لیے پروان چڑھ رہی ہے کہ پڑھے لکھے نوجوان کشمیریوں نے آزاد کشمیر/ پاکستان سے واپس جا کر آزاد کشمیر کی آئینی زبوں حالی اور پاکستان کے اندر اس کا کوئی مقام نہ ہونے اور اندرون آزاد کشمیر اس کے آزاد ہونے کی قلعی کھولی ہے۔ وگرنہ وہاں گنتی کے چند لوگ خودمختار کشمیر کے حامی تھے، غالب اکثریت پاکستان سے الحاق کے حامی تھے۔ 1990 کی تحریک کے بعد مقبوضہ کشمیر سے آنے والے لوگ بالخصوص جو تحریک سے وابستہ ہیں، سب راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور اور دیگر شہروں میں آباد ہو گئے ہیں اور سوائے کیمپوں کے رہنے والوں کے، کوئی آزاد کشمیر میں نہیں رہتا، لیکن سیاست کشمیر کے نام پر کرتے ہیں۔ آزاد کشمیر سے مہاجرین کے حقوق لیتے ہیں لیکن اس کے قومی دھارے میں شامل ہونے کے مخالف ہیں۔ حکومت پاکستان کو آزاد علاقوں کو آزادی کے ایسے ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہیے جو آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو قابل قبول ہو، ورنہ یہ حصے اس ماڈل کے ساتھ جائیں گے جو آزادی حاصل کر کے خودمختار حکومت بنائے گا اور یہ بہت تکلیف دہ مرحلہ ہوگا۔

میں نے ذاتی، منصبی اور ہر سطح پر کوشش کی کہ یہاں کے لوگوں کا مقام دوسرے ہم وطنوں کے برابر ہو جس کے لیے ذاتی طور قانونی جنگ لڑی، جج، چیف جسٹس، چیف الیکشن کمشنر، ایڈووکیٹ جنرل وغیرہ کی حیثیت سے اس سلسلہ میں جو کچھ ہو سکتا تھا کیا لیکن یہ قومی سیاسی جماعتوں کے مطالبے، امداد اور اعانت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تاہم اس سلسلے میں کوشش کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے اور ایسا کرنا میرے ایمان کا حصہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک روز آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لوگ بھی حکومت پاکستان کے آئینی اداروں میں موجود ہوں گے۔ اور اسی میں پاکستان اور کشمیر کا قومی مفاد ہے۔

پاکستان مسلم لیگ (ن) آزاد کشمیر کے منشور کمیٹی کی چیئرمین[191] کی حیثیت سے میں نے جو منشور 2011 اور 2016 کے الیکشن کے لیے تیار کیے، ان میں مرکزی اداروں میں نمائندگی کا باضابطہ مطالبہ رکھا گیا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ کے 2013 کے الیکشن کے منشور میں بھی اس کا اعادہ کیا گیا ہے جو قومی جماعتوں کی طرف سے یہ سب سے پہلا اور سب سے اچھا پیغام ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی میں نے اخباروں میں لکھنا شروع کیا اور ایک تنظیم Association for the Rights of People of Jammu & Kashmir (ARJK) بنائی جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کے حل ہونے تک آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو پاکستان کے آئین میں صوبہ بنائے بغیر اور متنازع حیثیت برقرار رکھتے ہوئے، صوبائی حقوق دیئے جائیں اور مقامی سطح پر پاکستان کے آئین کی اٹھارویں ترمیم کی روشنی میں مقامی حقوق بھی دیئے جائیں۔ جبکہ پوری ریاست جموں و کشمیر کو پاکستان کے آئین کی دفعہ نمبر 1 کے تحت متنازع ریاست کے طور اپنا حصہ ظاہر کیا جائے۔

اے آر جے کے (ARJK)

Association for the Right of the People of Jammu & Kashmir جس کا مخفف (ARJK) ہے، میری اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا ایک خواب ہے جو میں نے آزاد کشمیر میں اپنے سیاسی اور سرکاری کیریئر کے دوران دیکھا۔ میں نے بحیثیت جج بھی نظریاتی طور انہی خطوط پر فیصلے دیئے اور پاکستان کے مختلف اداروں سے اپنی عزت اور توقیر کی بحالی کے لیے قانونی اور سیاسی جنگ لڑی۔ جب مجھے 2006 میں چیف جسٹس بننے کے حق سے محروم کیا گیا جس کے خلاف کوئی چارہ جوئی بھی کارگر نہیں ہو سکی، الٹا پریشان کیا گیا۔ باقی کوئی کام کاج بھی نہیں تھا تو میں نے یہ پروگرام بنا لیا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد جس تنظیم کو قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس کے خدوخال اور بلیو پرنٹ تیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں میرا رابطہ اسلام آباد میں کئی پاکستانی سفارتکاروں اور جنرلز سے ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب زلزلہ کے بعد ہم لوگ اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ پاکستان کے سابق سیکریٹری خارجہ اور

عبوری دور کے وزیر خارجہ انعام الحق، ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر اشرف جہانگیر قاضی، جرمنی میں پاکستان کے سفیر آصف ایزدی، سکردو سے تعلق رکھنے والے صوبہ سندھ کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس افضل شگری، سابق وفاقی سیکریٹری شیخ محمد جنید جو کشمیر کونسل اور کشمیر منسٹری میں جوائنٹ سیکریٹری بھی رہ چکے تھے، سابق ایئر مارشل محمود اختر، جنرل (ر) عبدالقیوم، جنرل (ر) محسن کمال، PILDAT کے احمد بلال محبوب، سردار محمد ارشاد راولاکوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی وغیرہ سے معاملات ڈسکس کرتا رہا۔ اس کے علاوہ کشمیر کمیونٹی جو اسلام آباد میں آباد ہے، کے ساتھ بھی تعلق رہا۔ اس عرصہ کے دوران اپنے کیس کے سلسلہ میں پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ کے ججوں، معروف صحافیوں اور قلمکاروں کے علاوہ غیر ملکی سفارتکاروں سے واسطہ رہا۔ میری تجویز کے ساتھ اکثر لوگوں نے اتفاق کیا کہ کشمیر کے دونوں حصوں میں حقوق کے حصول اور بحالی کے لیے کوئی تھنک ٹینک یا تنظیم ضرور ہونی چاہیے جو انہی حقائق کا ادراک کر کے بتدریج مسائل کو آسان اور سہل بنانے کے علاوہ معاملات کے حل کے لیے راستہ ہموار کرے۔ چنانچہ تنظیم کے خدوخال کا خاکہ تیار کیا گیا۔ جناب آصف ایزدی نے اس کو مربوط کیا اور ایک آئین تیار کیا۔ درج بالا اصحاب کے علاوہ بہت سے لوگوں سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا جن کی تجاویز نے بھی کافی رہنمائی کی۔ آزاد کشمیر کے سیاست دانوں میں سے سردار خالد ابراہیم، راجہ فاروق حیدر خان، بیرسٹر سلطان محمود نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کئی نام زیر غور آئے لیکن اتفاق Association for the Rights of People of Jammu & Kashmir پر ہوا۔ چنانچہ 16 جون 2010 کو رجسٹرار سوسائٹیز آزاد کشمیر سے اسی نام سے اپنی تنظیم رجسٹر کرائی۔

ARJK کے پلیٹ فارم سے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لیے جدوجہد

آزاد کشمیر میں ہونے والی سیاسی اور سماجی سرگرمیاں چوں کہ زیادہ تر سیاست دانوں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں جو اقتدار کی خاطر اپنا ایجنڈہ سامنے رکھ کر انہیں ترتیب دیتے ہیں اس لیے انہوں نے گلگت بلتستان کو اپنی سرگرمیوں کا حصہ بھی نہیں بنایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے کی سیاسی اور دفاعی

حیثیت کے پیش نظر ایجنسیاں اس کو کسی طور پر موضوع بحث نہیں بننے دیتیں۔[191] ان لوگوں کی ناراضی سے بچنے کے لیے آزاد کشمیر کے سیاست دانوں نے بھی گلگت کے حق میں وہ بات نہیں کی اور نہ ایسا کوئی مطالبہ کیا جو وہ آزاد کشمیر کے بارے میں کرتے رہے ہیں۔

اس تنظیم کے دو اغراض و مقاصد ہیں جو ہمہ گیر دوررس نوعیت کے حامل ہیں:۔

نمبر1۔ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ سلامتی کونسل کی قراردادوں اور اقوام متحدہ کے منشور کے تحت کروانے کے لیے جدوجہد۔

نمبر2۔ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ہونے تک آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے لیے وہ سارے حقوق حاصل کرنا جو پاکستان کے اندر باقی صوبوں کو حاصل ہیں۔

اس تنظیم کا تعارفی خاکہ اور اس کے پہلے سیکریٹری جنرل ارشاد محمود مقرر ہوئے (جو بعد ازاں CPDR میں شامل ہو گئے) کا پہلا باضابطہ سیمینار جس میں اس تنظیم کا آغاز و افتتاح کیا گیا، اسلام آباد ہوٹل اسلام آباد میں 18 اگست 2010 کو ہوا۔ اس میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی بھرپور سیاسی اور سماجی نمائندگی تھی۔ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں کے اکابرین کی بھرپور شرکت تھی۔ حریت کانفرنس کے لوگوں نے بھی اس میں شرکت کی۔ تقریباً تمام شرکاء نے اس بات سے اتفاق کیا کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے آئینی معاملات کو یکسو کر کے ان علاقوں کو بااختیار بنایا جائے۔ کشمیر کے تنازع کو یو این سکیورٹی کونسل قراردادوں کے علاوہ چارٹر کے زمرے میں لانے کی کاوش کو بھرپور سراہا گیا۔ اس سے پہلے اس قسم کی سوچ موجود نہیں تھی۔ یہ ایک بالکل نئی سوچ تھی کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان دونوں کے لیے نہ صرف بہ یک وقت جدوجہد کا آغاز کیا گیا بلکہ ان کو صوبہ بنائے بغیر صوبائی حقوق کے حصول کے لیے قومی دھارے میں شامل کیے جانے کا مطالبہ بھی کیا۔

اس کے بعد اس کے متعدد اجلاس ہوئے جو اپنے فورم کے علاوہ دیگر انسانی حقوق کی تنظیموں کے فورم سے بھی منعقد کیے گئے۔ ہماری تنظیم کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ہم کسی بیرونی ملک سے اس کے لیے فنڈ نہیں لیں گے اور اپنے چندے سے ہی اس کا سارا نظم و نسق اور اخراجات پورے کریں

گے۔اس وجہ سے ارشاد محمود صاحب ہمیں چھوڑ کر CPDR میں ایگزیکٹیو ڈائریکٹر بن گئے۔

اس کے بالمقابل CPDR کے اغراض ومقاصد بھی تقریباً ایسے ہی ہیں لیکن اس میں گلگت بلتستان کو شامل نہیں کیا گیا ہے اوراس میں 1970 کے ایکٹ کی بحالی کے علاوہ ترقیاتی منصوبوں کو شامل کیا گیا ہے۔اس تنظیم کے لوگوں کی اکثریت پاکستان میں آباد ریاستی باشندے ہیں جو آزادکشمیر کے قومی دھارے میں شامل ہونے کے مخالف ہیں کیوں کہ پھر آزادکشمیر کے لوگ بھی اس لیول پر پہنچ جائیں گے جس پر یہ لوگ ہیں اس لیے ان کی خواہش ہے کہ صورت حال بحال رہے۔اقتصادی ترقی اور فائدہ ہی اگر منتہائے نظر ہے تو وہ تو انگریز بھی ہندوستان میں کرتے تھے اور ہندوستان بھی کشمیر میں کرتا ہے۔اصل بات حیثیت،شناخت،مقام،فیصلہ اور پالیسی سازی میں اثر انداز ہونے کی ہے جس کی عدم موجودگی میں ہم انسان تو ہیں لیکن شہری نہیں ہیں۔

اس تنظیم کی سرگرمیوں کے سلسلے میں مجھے آزادکشمیر اور باقی صوبوں کے مختلف علاقوں میں جانا پڑا۔میں تقریباً تمام بارایسوسی ایشنز میں گیا۔پریس کلب اور طلبا تنظیموں سے رابطہ ہوا۔اس کے اغراض ومقاصد سے سب اتفاق کرتے ہیں،البتہ سرگرمیاں نہیں دکھا رہے اور نہ ہی اس کے حق یا مخالفت میں کوئی بات کرتے ہیں۔جس کی دو وجوہات ہیں ایک تو اس تنظیم کے اخراجات ہم خود برداشت کرتے ہیں اور کسی بھی شخص کو اپنے خرچ پر نہ تو مہنگے ہوٹلوں میں ٹھہرا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی کسی اورطرح سے مالی اعانت کرسکتے ہیں جیسا کہ زلزلے کے بعد تنظیموں نے عادت ڈال دی ہے یا بیرونی اداروں کی مدد سے کشمیر کے نام پر این جی اوز کرتی ہیں۔دوسرا ساٹھ سالہ جمود جس میں آزادکشمیر کی سیاسی اور سماجی زندگی پر جنرل ضیا مرحوم اوراس کے بعد مشرف کی حکومت تک ایجنسیوں کا غلبہ رہا جس نے لوگوں کو بزدل اور مفادات کی سیاست میں پھنسا دیا ہے۔اس تنظیم اوراس کی سوچ کی مخالفت کچھ لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ ممکن ہے یہ بھی ایجنسیوں نے شروع کروائی ہو،(یہ گمان اس لیے ہے کہ ہم ان علاقوں کو قومی دھارے میں لانا چاہتے ہیں)اگر مخالفت کی گئی تو ایجنسیاں ناراض ہوں گی،حمایت بھی اسی لیے نہیں کرتے کہ ممکن ہے ایجنسیاں اس کو پسند نہ کرتی ہوں اور اگر حمایت کی گئی تو وہ پھر بھی

183

191

ناراض ہو جائیں گی۔یہ سوچ اس سیاسی پس منظر کی عکاس ہے جس میں یہاں کے لوگوں نے پرورش پائی ہے اورجس کے تحت سیاست اور طاقت کا سرچشمہ حساس اداروں کو سمجھتے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے کئی یونیورسٹیز،اکیڈمیز،سیاسی اور سماجی تنظیموں کی دعوت پر شرکت کا موقع ملا جن میں لاہور اور اسلام آباد NIMS،اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد،کامسیٹس اسلام آباد،PILDAT،بارایسوسی ایشن راولپنڈی اور لاہور،فیڈرل جوڈیشل اکیڈمی ان سب سے مجھے کشمیر کے حوالہ سے اپنی تنظیم کے اغراض ومقاصد بیان کرنے اوران لوگوں تک اس کا پیغام پہنچانے کا بہت اچھا موقع ملا۔اس تنظیم کا لٹریچر بھی شائع کیا گیا جو کہ PILDAT کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔تنظیم کی اپنی ویب سائٹ بھی قائم کی گئی جس کا ایڈریس www.ARJK.org ہے جس میں تنظیم سے متعلق ساری سرگرمیاں موجود ہیں۔

آزادکشمیر کے آئینی اختیارات کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان میں پٹیشن

میرے سپریم کورٹ آف پاکستان میں پٹیشن دائر کر کے آزادکشمیر اور پاکستان کے درمیان آئینی تعلقات کو ابھارنے اوراس کے بعد اس تنظیم کے ذریعہ اپنا آئیڈیا دینے کی وجہ سے آزادکشمیر میں رائج ایکٹ 1974 پر بحث شروع ہوگئی۔اور تقریباً ساری سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں اور اپنے انتخابی منشوروں میں یہ درج کر رہے ہیں کہ آزادکشمیر کو اتنے آئینی اختیارات دیئے جائیں جتنے پاکستان کے آئین میں اٹھارویں ترمیم کے بعد پاکستان کے صوبوں کو دیئے گئے ہیں۔اس سلسلے میں پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت پاکستان نے،آزادکشمیر اسمبلی کے ممبروں پر قائم کمیٹی کو یہ اختیار دیا کہ وہ سیاسی اور سماجی تنظیموں سے سفارشات وصول کر کے مرکزی حکومت کو دیں جس کے مطابق آئین میں ترمیم ہوگی۔کمیٹی نے سفارشات بھیج دی ہیں لیکن ایسا فی الحال ہونے کا امکان نظر نہیں آتا لیکن ایک بحث کا آغاز ہوگیا ہے۔مسلم لیگ کی مرکزی حکومت نے بھی اب ایک کمیٹی قائم کی ہے،میں اللہ کا شکر کرتا ہوں کہ میرے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف میری آواز نے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ مقامی کھڑپنچوں کی غلامی کی زندگی سے نکل کر قومی دھارے میں شامل ہونا چاہیے۔اور قومی سطح پر پالیسی سازی

اور فیصلہ سازی میں حصہ دار بننا چاہیے۔ جبکہ اس سے پہلے کوئی ایسا سوچتا بھی نہیں تھا، مطالبہ تو دور کی بات ہے۔ مجھے تو میرے چند دوستوں اور خیر خواہوں نے ایسا کرنے اور کہنے سے منع بھی کیا اور ڈرایا دھمکایا بھی کہ ایجنسیاں پیچھے پڑ جائیں گی، لیکن اس کے بعد سب اداروں کو اس پر سوچنے کے لیے آمادہ کر دیا۔

ہماری تنظیم نے آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور پاکستان کے آئین میں ترمیم کر کے ان علاقوں کو بااختیار کرنے کے لیے ایک آئینی مسودہ تیار کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب Azad Jammu & Kashmir and Gilgit Baltistan Proposals for Enhanced Autonomy and Empowerment کے نام سے شائع ہوئی۔ 2014 میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے تمام اخراجات جناب محمد افضل شگری نے برداشت کیے ہیں۔ اس میں دونوں علاقوں کے مقامی آئینی دستاویزات کی دفعہ بہ دفعہ ترامیم کی تجاویز کے علاوہ پاکستان کے آئین میں کشمیر کی حد تک ترامیم کی تجاویز دی گئی ہیں جن کے مقاصد یہ ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کا حتمی حل سلامتی کونسل کی قراردادوں اور یو این چارٹر کے تحت ہی ہونا ہے اور اس حل تک ریاست کے پاکستانی زیر انتظام علاقوں کو ملک کے باقی صوبوں کے برابر حقوق حاصل ہوں۔ اس کے لیے پاکستان کے آئین کی ان دفعات کا ان علاقوں پر مقامی حکومتوں کی منظوری سے اطلاق کیا جائے گا جو ان حقوق کے حصول کے لیے ضروری ہوں۔ ان میں پارلیمنٹ میں نمائندگی، کونسل آف کامن انٹرسٹ، نیشنل فنانس کمیشن، نیشنل اکنامک کونسل، پانی اور بجلی پیدا کرنے کے حقوق وغیرہ شامل ہیں۔ اب آزاد کشمیر کی قومی جماعتوں نے اپنے اپنے منشور میں بھی ان کو کسی نہ کسی طور شامل کیا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) آزاد کشمیر کے 2011 کے انتخابی منشور میں سوائے پارلیمنٹ میں نمائندگی کے باقی تمام اداروں میں نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے باضابطہ وعدہ کیا گیا ہے۔ اس تنظیم کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے پبلک لائف کو متحرک کر دیا ہے۔ اب مرکزی مسلم لیگ (ن) نے 2013 کے قومی الیکشن کے منشور میں بھی ان علاقوں کو نمائندگی دینے کے حق کو منشور کا حصہ بنایا ہے۔ جبکہ مسلم لیگ (ن) آزاد کشمیر نے 2016 کے الیکشن منشور میں مکمل صوبائی حقوق کا وعدہ اور مطالبہ کیا ہے۔

فی الوقت پاکستان کی پارلیمنٹ میں آزاد کشمیر سے باہر کے لوگ ہی کشمیر کے بارے میں بات کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں جس میں کشمیر کا کوئی نمائندہ نہیں۔ جبکہ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں کشمیر کے نمائندے بھی ہندوستان کے موقف کا دفاع کرتے ہیں اور اس میں بین الاقوامی سطح پر وزن ہے۔ ان کے مقابلے میں پاکستان میں غیر ریاستی باشندوں کی بات کا سوائے اس کے اور کوئی وزن نہیں کہ وہ اس میں فریق ہیں۔ ریاستی باشندے جب علامتی طور پر یا بالواسطہ انتخاب کی صورت میں ہی ملکی سطح پر کشمیر کی بات کریں گے اس کا اور وزن ہوگا۔ علاوہ ازیں حکومت پاکستان کے درج بالا آئینی ادارے جب پالیسی بناتے اور فیصلے کرتے ہیں تو اس سے آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی کوئی نمائندگی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود یہ ان فیصلوں کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی غیر منصفانہ اور غیر جمہوری طرزِ عمل ہے اور حق خود ارادیت کے اس اصول کے خلاف ہے جس کے لیے کشمیری لڑ رہے ہیں۔

ARJK کی تجویز پر عمل ہونے کی صورت میں پاکستان کے کشمیر کے موقف پر حرف آنے کے بغیر ہی وہ سارا کچھ ہو جائے گا جو کشمیر کے پاکستان کا صوبہ بن کر ہو سکتا ہے۔ ان علاقوں کے اس حیثیت میں آئین پاکستان میں شامل ہونے سے پاکستان کی کوئی حکومت ان علاقوں کی حیثیت اور جغرافیائی شناخت کو پاکستان کی دوسری ریاستوں میں ضم کر کے ختم نہیں کر سکتی۔ اندرونی اور عالمی سطح پر پاکستان کی کشمیر کے بارے میں ایک آئینی کمٹمنٹ ہو جائے گی۔ فرق یقیناً ان لوگوں یا جماعتوں یا این جی اوز کو پڑے گا جو کشمیر کا نام استعمال کر کے اقتدار اور مالی فوائد حاصل کر رہے ہیں۔ جب تک ان کو کسی نظم میں نہیں لایا جائے گا کشمیر پر پاکستان اور کشمیری یک زبان نہیں ہو سکتے۔ اگر اس کو دوسری نظر سے دیکھا جائے تو بھی ایسا ہی کیا جانا حالات کا لازمی تقاضا ہے کیوں کہ آزاد کشمیر سے آئین کے تحت الحاق پاکستان کی لازمی شرط کے بعد کشمیریوں کے پاس اور کوئی آپشن بھی نہیں رہتا تو ان کو اس استحقاق سے کیوں محروم رکھا جائے جو پاکستان کے دوسرے حصوں کو حاصل ہیں؟ علاوہ ازیں پاکستان کے موقف میں ایک آئینی وزن پیدا ہو جائے گا، وگرنہ پاکستان کی روز بروز کی کمزور اور ہندوستان کی مضبوط ہوتی ہوئی پوزیشن سے ہندوستان ان علاقوں، مہاراجہ کے الحاق اور اپنے آئین میں آئینی

پوزیشن کے پیش نظر، زبردستی کلیم کرے گا۔ یہ قومی سلامتی کا مسئلہ ہے۔ اس وقت ان علاقوں کا پاکستان کے ساتھ رشتہ مرکزی سیاسی جماعتوں اور مرکزی ایجنسیوں اور بیوروکریسی کے ذریعہ قائم ہے۔ اس کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں بی جے پی کی حکومت کے بعد ان کی واضح قومی پالیسی ہے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان، جس کو وہ PoK کہتے ہیں، کو پاکستان سے آزاد کرایا جائے۔

آزاد کشمیر میں سیاست

آزاد کشمیر میں جب میں آباد ہو گیا اور وکالت کے پیشے میں نمایاں مقام بھی حاصل کر لیا تو 1979 میں پہلی بار سیاسی زندگی کے افق پر نمودار ہوا۔ ان دنوں سیاسی جماعتوں پر تقریباً پابندی تھی۔ ضیاالحق کے مارشل لاء کے اثرات آزاد کشمیر پر بھی تھے جہاں پر پہلے جنرل عبدالرحمان کو منتظم اعلیٰ مقرر کیا گیا، بعد ازاں بریگیڈیئر محمد حیات خان کو ان کی جگہ لگایا گیا۔ آزاد کشمیر میں بھی باقی ملک کی طرح بلدیات، عشر و زکوٰۃ کے قانون نافذ کیے گئے۔ میں ضلع مظفرآباد سے زکوٰۃ کمیٹی کا ممبر منتخب ہو کر اس کا چیئر مین منتخب ہوا۔ اس کے لیے مجھے اس وقت مظفرآباد کے ایک صاحب علم و حکمت مرحوم مولوی محمد عرفان صاحب نے آمادہ کیا تھا۔ اس طرح آزاد کشمیر کے سیاسی حلقوں میں ریاستی سطح پر پہلی بار سامنے آیا۔ حیات خان کی حکومت میں حکومتی سیکریٹریز میں سے راجہ نیاز احمد خان مرحوم، راجہ عبدالخالق خان مرحوم، خلیل احمد قریشی اور غلام احمد پنڈت مرحوم سے میرے اچھے تعلقات تھے جن کے ذریعے میں حیات خان کی کچن کیبنٹ میں بھی زیر بحث رہا۔ اس لیے حکومت کی طرف سے اکثر مقدمات مجھے دیئے جاتے تھے جس وجہ سے مجھے سرکاری اثر و رسوخ حاصل ہو گیا۔ حیات خان کی سخت گیری کی وجہ سے سیاست دان بہت نالاں تھے جن کے خلاف جائز و ناجائز الزامات کی بنیاد پر مقدمات بنائے گئے اور ان کو نظر بند بھی رکھا گیا۔ اس لیے سیاست دان ان کی حد تک اکھٹے ہو گئے اور ان کو ہٹانے کی تحریک زور پکڑ گئی۔ مرکز میں ضیاالحق نے اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے مجلس شوریٰ نامی ایک فرضی قسم کی اسمبلی بنائی جس کے ذریعہ سیاست دانوں بالخصوص دائیں بازو کے سیاست دانوں کو اپنے دام فریب میں لایا۔ 1980 کی دہائی میں افغانستان میں روسی مداخلت اور قبضہ کی وجہ سے پاکستان کی اہمیت بڑھ گئی اور

191

ضیاالحق مغرب کی آنکھوں کا تارا بن گئے جنہوں نے جہاد کے نام پر پاکستان بھر کے سکولوں، مدرسوں اور خانقاہوں کو افغانستان میں جہاد کے لیے نوجوانوں کو بھرتی کرنے کا ٹاسک دے دیا جس کے عوض ان پر ڈالروں کی برسات ہونا شروع ہو گئی۔ اس تھور کی فصل پاکستان اب کاٹ رہا ہے۔

ادھر آزاد کشمیر میں سردار عبدالقیوم، جو اس وقت مقدمات بھگت رہے تھے، نے اندرون خانہ ضیاالحق سے مراسم بڑھائے اور عدالتوں سے بریت خاص کر کے سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ آزاد کشمیر میں قیام کے دوران میرے کے ایچ خورشید مرحوم اور سردار عبدالقیوم کے ساتھ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ کے ایچ خورشید قائداعظم کے سیکریٹری، کشمیری نژاد، بیرسٹر اور صاف ستھری شہرت کے حامل ہونے کی وجہ سے میرے لیے بڑی کشش کا باعث تھے جبکہ سردار عبدالقیوم خان کی دین داری، مسلم لیگ کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس کا سربراہ ہونا اور اس کی اچھے اور منصف مزاج ہونے کی شہرت نے مجھے کافی متوجہ کیا تھا۔ ان کی آزاد کشمیر بھر میں پذیرائی بھی کافی تھی اور میرے خاندان والے تو تقریباً سب ہی ان کے ساتھ تھے۔ میں نے ان دو جماعتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہونے کے لیے ان کے حق میں اور خلاف دلائل کا جائزہ لیا جس میں مسلم کانفرنس کا پلڑا بھاری نظر آیا۔ کے ایچ خورشید مرحوم کے بیرسٹر اور ایک منفرد نعرے میں خاصی جاذبیت تھی لیکن بعد ازاں اس نعرے کو ترک کر کے پیپلز پارٹی میں مدغم ہونے اور پھر بھٹو صاحب مرحوم کے اقتدار سے محرومی کے بعد اس پارٹی کو چھوڑ کر دوبارہ لبریشن لیگ کو بحال کرنے کی بات مجھے پسند نہیں آئی۔ مسلم کانفرنس تسلسل کے ساتھ آزاد کشمیر میں مسلم لیگ کا قائم مقام ہونے والی بات میری پسندیدگی کا باعث بنی کیوں کہ یہ پاکستان کی خالق جماعت ہے اور پاکستان اور مسلم لیگ کے ساتھ اس زمانے میں کشمیر کے تمام مسلمانوں کی بھرپور عقیدت تھی۔ چنانچہ میں نے مسلم کانفرنس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ غالباً 1982 کے وسط کی بات ہے جب پیر صاحب پگاڑا شریف، مرحوم محمد خان جونیجو آزاد کشمیر کے دورے پر آئے تھے اور ان میں سے کوئی ایک مسلم لیگ پاکستان کے سربراہ تھے۔ اسمبلی ہاسٹل مظفرآباد میں انہوں نے مسلم کانفرنس کے کارکنوں سے خطاب بھی کرنا تھا۔ میرا پیغام سردار

عبدالقیوم خان کو ملا کہ میں بھی مسلم کانفرنس میں شمولیت کرنا چاہتا ہوں، انہوں نے اس تقریب میں مجھے شمولیت کی دعوت دی۔ چنانچہ میں وقت مقررہ پر وہاں پہنچ گیا اور اپنی شمولیت کے موقع پر تقریب میں یہی بات کہی کہ میں اس لیے مسلم کانفرنس جوائن کر رہا ہوں کہ یہ مسلم لیگ کی نمائندہ جماعت ہے اور مسلم لیگ کے صدر بھی یہاں موجود ہیں۔ اس جماعت کی وجہ سے پاکستان وجود میں آیا جس کے پیش نظر میں اپنی سیاسی وابستگی اس جماعت کے ساتھ وابستہ کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں مسلم کانفرنس کے سرگرم اور فعال ترین رکن کے طور پر جانا پہچانا جانے لگا۔ اور سردار عبدالقیوم خان کے اندرون خانہ افراد میں شمار ہونے لگا جس وجہ سے مجھے ان کے زندگی کی ہر پہلو کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں ان کا بیٹا سردار خلیق احمد ان کے قریب تھا۔

میں نے سیاسی سرگرمیاں اسی پلیٹ فارم سے بہت تیز کر دیں اور کئی لوگوں کو مسلم کانفرنس میں شامل کرایا۔ میں نے خود 1983 میں مظفرآباد میونسپل کارپوریشن کے پلیٹ کے وارڈ سے الیکشن لڑا۔ میرے لیے یہ حیرانی کی انتہا تھی کہ میرے بالمقابل مسلم کانفرنس کا بہت ہی قریب ترین اور تحصیل صدر مرحوم ملک عبدالعزیز نامی ایک شخص الیکشن لڑنے کے لیے میدان میں تھا جو سردار عبدالقیوم خان صاحب کا قریب ترین انسان تھا۔ اس کے علاوہ لبریشن لیگ کے ضلع مظفرآباد کا صدر عبدالجبار میر تھا۔ پیپلز پارٹی، مسلم کانفرنس اور لبریشن لیگ کے تمام کارکنان بالخصوص خواتین نے میری حمایت کی جس وجہ سے میں ان دونوں امیدواروں کو ہرا کر رکن منتخب ہوا۔ سردار عبدالقیوم خان نے مجھے کارپوریشن کے چیئرمین کے الیکشن کے لیے آمادہ کیا لیکن عملی طور پر ملک عرفان کو منتخب کروایا۔ اس عرصہ کے دوران 1985 میں آزاد کشمیر میں اسمبلی کے انتخابات ہوئے جس میں مجھے مسلم کانفرنس کا چیف الیکشن ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ میں نے اس الیکشن میں بہت محنت کی۔ سردار عبدالقیوم خان کے ساتھ مظفرآباد ضلع کے لیپہ سے لے کر تاؤبٹ تک مشکل ترین علاقوں میں انتخابی مہم چلائی اور تقریریں کیں۔ چوں کہ میں کشمیری زبان روانی سے بولتا تھا، اس لیے لیپہ اور ضلع نیلم کے کشمیری بولنے والے لوگوں کے جلسوں میں بالخصوص بلایا جاتا تھا۔

1985 کے الیکشن میں اسمبلی الیکشن مسلم کانفرنس نے باقی جماعتوں، پیپلز پارٹی، تحریک عمل

191

اور لبریشن لیگ کے مقابلے میں سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں اور مرکزی حکومت کی مدد کی وجہ سے آزاد کشمیر میں حکومت بنائی۔ سردار عبدالقیوم صاحب خواہش کے برعکس وزیراعظم کی بجائے صدر منتخب ہوئے جبکہ سکندر حیات وزیراعظم منتخب ہوئے۔ سکندر حیات در پردہ سردار عبدالقیوم کی مخالفت کرتے تھے حالاں کہ ان کو جماعت میں نمایاں پوزیشن دلانے میں سردار عبدالقیوم خان کا نمایاں کردار تھا۔

1985 کے انتخابات کے بعد میں نے حکومت سازی میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ حلقہ نیلم میں میاں غلام رسول مرحوم اور سردار گل خندان کے درمیان کانٹے دار مقابلہ تھا۔ میاں غلام رسول بہت ہی لائق، ذہین اور علم دوست شخص تھے۔ ان کا علم وآگہی کی وجہ سے علاقے میں کافی اثر رسوخ تھا جبکہ سردار گل خندان ایک خوش حال خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور کافی عرصہ سے وادی نیلم میں اس خاندان کی ایک نمایاں سیاسی اور سماجی پوزیشن تھی۔ مقابلہ سخت تھا۔ میاں صاحب اپنے اثر ورسوخ سے ووٹوں کی گنتی میں ہیرا پھیری کر کے کامیاب ہوئے۔ جبکہ ہم نے دوبارہ گنتی کے لیے درخواست جمع کرادی۔ کافی زور کے بعد نعیم شیراز جو سیکریٹری حکومت کے طور ریٹائر ہوئے اس وقت وہاں اسسٹنٹ کمشنر تھے، نے دوبارہ گنتی کی اجازت دی جس میں سردار گل خندان میرے خیال میں 60 ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں سے عبداللطیف سلہریا جو مہاجرین کی وادی والی نشست کی امیدوار کی حیثیت سے جیتے تھے، کو میں نے سید قاسم شاہ، جو اس وقت کشمیر کے معاملات کے وزیر تھے، کی مداخلت سے مسلم کانفرنس جوائن کرانے پر آمادہ کیا جس کے بعد مسلم کانفرنس کی حکومت بننے کی راہ ہموار ہوگئی۔

مسلم کانفرنس کے منتخب اور ہارے ہوئے امیدواروں کی جانب سے میں الیکشن ٹریبونل میں وکیل مقرر ہوا اور اس کے ساتھ ہی سال 1986 میں مجھے آزاد کشمیر کا ایڈووکیٹ جنرل مقرر کیا گیا۔ بطور سرکاری وکیل، میں حکومت اور جماعت کے قریب رہا لیکن سال 1990 میں سردار سکندر حیات کے نکیال اور جموں 6 سے بہ یک وقت الیکشن لڑنے کے فیصلے پر اختلاف کی وجہ سے مستعفی ہوگیا۔ تاہم اس کے بعد بھی ان کی ہی جماعت کے پلیٹ فارم سے سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مسلم کانفرنس 1990 کے

الیکشن ہار گئی جبکہ سکندر حیات خان دونوں حلقوں سے جیتنے کے بعد جموں 6 سے محض اسی وجہ سے نا اہل قرار دیئے گئے جو میری ان سے اختلاف کی وجہ تھی۔ (یہ واقعات پیچھے گزر چکے ہیں)۔ پیپلز پارٹی الیکشن جیتی اور ممتاز حسین راٹھور مرحوم وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ 1991 میں ہائی کورٹ کا جج تعینات ہونے کی وجہ سے آزاد کشمیر میں میری سیاسی سرگرمیوں کا پہلا باب بند ہو گیا۔

مسلم لیگ (ن) میں شمولیت

ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد متحدہ قومی مومنٹ (MQM) جو دراصل مہاجر قومی مومنٹ کا ٹریڈ نام ہے، کی رابطہ کمیٹی کے چند لوگ طاہر کھوکھر ممبر اسمبلی کے ساتھ میرے گھر پر تشریف لائے اور مجھے ایم کیو ایم میں شامل ہونے کی دعوت دے کر بے شمار سبز باغ دکھائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کر بھی سکتے تھے لیکن میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے معذرت کی۔ میں نے ان کو کہا کہ مجھے اس جماعت کے قائد الطاف حسین کی لوئر مڈل کلاس لوگوں کو آگے لانے کی خوبی بہت پسند ہے لیکن جو شخص اپنے آپ کو ملک میں محفوظ نہ سمجھتا ہو اور اپنا خطاب بذریعہ فون سنانے کے لیے لوگوں کو بھوت بنا کر بٹھا دیتا ہے، اس کے ساتھ میں نہیں چل سکتا۔ یہ آپ لوگوں کا ہی حوصلہ ہے جو ایسا کرتے ہیں۔

سیاسی اور ایجنسیوں کی سازش کی وجہ سے 2006 میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بننے کے حق سے محروم ہونے کے بعد سے ہی میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ریٹائرمنٹ لے کر مسلم لیگ (ن) میں شمولیت اختیار کروں گا۔ میں اس عرصہ کے دوران اسلام آباد میں ہی مقیم رہا جہاں میرے رابطے مسلم لیگ (ن) کی قیادت سے رہے جن میں مہتاب عباسی، پرویز رشید، احسن اقبال، ظفر علی شاہ، راجہ ظفر الحق وغیرہ شامل ہیں۔ میرا رابطہ پیپلز پارٹی کے قمر الزمان کائرہ، خورشید احمد شاہ کے ساتھ بھی رہا۔ لیکن میں چوں کہ اس وقت تک ریٹائر نہیں ہوا تھا، اس لیے برملا کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا۔ تاہم بار ایسوسی ایشنز اور سوشل سروسز کی تنظیموں کے ساتھ منسلک رہا۔

اس عرصہ کے دوران آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس میں اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ سکندر حیات اور فاروق حیدر کے دھڑے آزاد کشمیر میں مسلم لیگ (ن) کی بنیاد ڈالنے کے

خواہشمند تھے لیکن میاں نواز شریف اس پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کی وجہ[191] مقامی ایجنسیاں اور کشمیر کی حریت کانفرنس کی قیادت تھی جن کو عتیق خان استعمال کرتا تھا۔ عتیق خان نے حریت کانفرنس پاکستان برانچ کے چیئرمین سید یوسف نسیم کی بیگم مہر النساء کو اسمبلی کا ممبر، منسٹر اور پھر ڈپٹی سپیکر بھی بنوایا۔ اس عمل میں پاکستان میں آباد حریت کانفرنس اور مہاجرین لوگ تقسیم ہو کر آزاد کشمیر کے اقتدار میں شامل ہو گئے جو افسوس ناک امر ہے۔ ایجنسیاں تو عتیق خان کو ایک مؤثر مہرے کی طرح استعمال کرتی رہی تھیں اور اب بھی کرتی ہیں جبکہ حریت کانفرنس کی عتیق خان مدد کرتے تھے اور ان کے پاکستان میں مقیم نمائندوں کے ساتھ گہرے روابط تھے جن کے ذریعہ کشمیر میں حریت کے نمائندوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ میرے سرینگر کی حریت لیڈرشپ کے لوگوں میں سے سید علی گیلانی، پروفیسر عبدالغنی بھٹ اور بلال لون کے ساتھ ذاتی اور گہرے تعلقات ہیں، اسی طرح یاسین ملک کے ساتھ میری دعا سلام ضرور تھی لیکن سرینگر میں ان کے حلقہ احباب کے ظفر شاہ ایڈووکیٹ، ڈاکٹر الطاف اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ تعلقات تھے جن تک یہ بات میں نے پہنچائی کہ سرینگر کی لیڈرشپ کو آزاد کشمیر میں مسلم لیگ (ن) کی توسیع کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس سے مسئلہ کشمیر کو فائدہ پہنچے گا۔ کشمیر کے معاملے میں اصل حیثیت پاکستان کی لیڈرشپ کی ہے، آزاد کشمیر کی نہیں، جو محض اپنے اقتدار کی خاطر ان کی سیاست کرتے ہیں۔ ادھر بھی حریت کی لیڈرشپ سے میرا کافی تعلق واسطہ رہا ہے جن میں محمد فاروق رحمانی صاحب لبریشن فرنٹ کے نمائندے میر واعظ کشمیر کے نمائندے فیاض نقشبندی، شبیر احمد شاہ کے نمائندے محمد ساغر صاحب، غلام محمد صفی اور اشرف صراف میرے کلاس فیلو اور دیگر لوگ میری ان خدمات کے بہت معترف ہیں جو میں نے ان کے قانونی معاملات حل کرنے کی بہم پہنچائیں جن میں شناختی کارڈ، سٹیٹ سبجیکٹ سرٹیفکیٹ کا اجراء، ووٹ کا حق وغیرہ۔ ان کے ساتھ بھی اس معاملہ میں مکالمہ رہا۔ الحمدللہ برف پگھلنے لگی اور مسلم لیگ (ن) کے دائرہ کار کو آزاد کشمیر تک بڑھانے کی رکاوٹیں دور ہو گئیں۔

میاں محمد نواز شریف مظفر آباد میں اور مسلم لیگ کا باضابطہ قیام

سکندر حیات خان، راجہ فاروق حیدر خان، شاہ غلام قادر وغیرہ کی کوششیں مسلم لیگ کے قیام کے لیے جاری تھیں۔سکندر حیات وغیرہ راجہ نیٹ ورک پر کوشاں تھے جو راجہ ظفر الحق، راجہ افضل، مصطفی کھر، سلیم ضیا وغیرہ کے ذریعہ میاں صاحب کو آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور میاں صاحب نے 26 دسمبر 2010 کو مظفر آباد میں مسلم لیگ کے آزاد کشمیر میں قیام کے لیے جلسہ بلایا۔23 دسمبر 2010 کو انہوں نے لاہور سے جسٹس خواجہ محمد شریف کے گھر سے مجھے فون کر کے مسلم لیگ (ن) میں شامل ہونے کی دعوت دی جس کو میں نے قبول کیا۔اس سے پہلے میں نے راجہ فاروق حیدر اور شاہ غلام قادر سے کہا تھا کہ میاں صاحب کے جلسے میں، میں بھی شمولیت کا اعلان کروں گا لیکن وہ لوگ ٹال مٹول کرتے رہے کہ اس دن سکیورٹی بہت سخت ہو گی۔میاں صاحب کے پاس وقت نہیں ہو گا کہ میں جلسے میں تقریر کر سکوں اس کے بعد کسی وقت کسی مرکزی لیڈر کی موجودگی میں میری شمولیت کروائی جا سکتی ہے۔میرے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ جس جماعت کے ادھر قیام کے لیے میں نے اتنی کوشش کی، اس کے یوم تاسیس اور اس کے لیڈر کی موجودگی میں جوائن نہ کیا جائے تو اس ساری مشق کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

چنانچہ جب میاں صاحب نے خود مجھے فون کر کے دعوت دی اور ان لوگوں کو میرے جلسے میں لانے اور تقریر کرنے کی ہدایت کی تو شاہ غلام قادر نے مجھے فون پر بتایا کہ انہوں نے میرے لیے وقت نکال لیا ہے، میں اس جلسے میں شرکت کر کے محض شمولیت کا اعلان کروں گا۔ میں نے تو ان کو کچھ نہیں کہا لیکن اپنی جگہ پر سوچا کہ اگر میاں صاحب نے ان کو نہ کہا ہوتا تو یہ لوگ ایسا نہ ہونے دیتے۔ حالاں کہ مسلم لیگ آزاد کشمیر کے قیام میں میرا بنیادی کردار تھا اور میرے مسلم لیگ (ن) میں شامل ہونے سے ان کی جماعت اور ان کا قد کاٹھ مضبوط ہو رہا تھا کیوں کہ جس پس منظر میں، میں شامل رہا تھا، وہ آزاد کشمیر کے اندر میرے ذاتی اور خاندانی اثر و رسوخ اور مقبوضہ کشمیر میں میرے تعلقات کے پس منظر میں جماعت کے لیے بڑی توقیر کا باعث تھا۔لیکن مقامی لیڈر شپ کا خیال تھا کہ میرے آگے آنے

سے ممکن ہے، ان کا قد کاٹھ متاثر ہو۔ حالاں کہ یہ سوچ غلط ہے کیوں کہ بحیثیت سیاسی ورکر میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ میں اپنا کیریئر شاندار طریقہ سے مکمل کر کے ریٹائر ہوا ہوں۔ جبکہ ان کے کیریئر کا ایک تسلسل ہے اور وہ لوگ فیلڈ میں جماعت کو جس طریقے سے منظم کر سکتے ہیں، میں وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ میری خیر سگالی سے ان کو فائدہ ضروری پہنچ سکتا تھا۔

میرا مسلم لیگ (ن) کے آزاد کشمیر میں قیام اور اس میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ میرا قیام پاکستان کے ساتھ وابستگی اور اس میں مسلم لیگ کا کردار ہے۔ جب میں نے آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس جوائن کی تھی، اس وقت بھی میں نے یہی کہا تھا کہ یہ جماعت چوں کہ مسلم لیگ کی نمائندہ ہے جس نے پاکستان بنایا جس وجہ سے میں اسے جوائن کر رہا ہوں۔ آزاد کشمیر اور یہاں کے لوگوں کی سیاسی بے توقیری اور کسمپرسی کا واحد حل اس کے قومی دھارے میں شامل ہونے میں ہے۔ میں نے اس سلسلے میں نوائے وقت اور دیگر مقامی اخباروں میں لکھنا شروع کر رکھا تھا اور قومی دھارے میں شامل ہونے کے لیے بھرپور وکالت کی تھی، مجھے آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کے قیام اور اس کے ذریعہ یہاں کے لوگوں کو پہنچنے والے فوائد کا ادراک حاصل ہے جو پاکستان کی حکومت نے الیکٹورل کالج کا حصہ نہ ہونے کے باوجود وہاں کی قومی قیادت سے منسلک ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے لیے بے شمار فوائد حاصل کیے گئے۔ اسی طرح جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان کے ساتھ شامل ہونے والوں کی وجہ سے اس علاقے کے لوگوں کا وہاں تک اپنی بات پہنچانا جہاں طاقت کے مراکز ہیں، اس علاقے کی توقیر کا باعث ہے۔ میرا قومی دھارے میں شامل ہونے کے لیے اپنے فلسفے کو عملی جامہ پہنچانے کے لیے اس جماعت میں شامل ہونا ناگزیر تھا کیوں کہ جب تک مرکز میں فیصلہ ساز جماعتوں تک ہماری آواز نہیں پہنچتی، یہ صدا بہ صحرا ہی رہتی۔ اس کے علاوہ میں چوں کہ طبعی طور ایک متحرک انسان ہوں اور اپنے متحرک خیالات کی وجہ سے جامد و ساکن نہیں رہ سکتا، اس لیے کسی پلیٹ فارم پر ہونا لازمی امر تھا۔ اس سوچ کے پس منظر میں، میں نے مسلم لیگ (ن) کے آزاد کشمیر میں قیام اور اس میں شمولیت کرنا ناگزیر سمجھا۔

؎ ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا   آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

26 دسمبر 2010 کو میاں صاحب مرکزی قیادت پرویز رشید، اقبال ظفر جھگڑا، راجہ ظفر الحق، سلیم ضیا وغیرہ کے سمیت مظفرآباد یونیورسٹی کالج گراؤنڈ میں آئے جہاں مسلم لیگ (ن) کے با ضابطہ قیام کا اعلان کیا۔ اس جلسہ میں مقامی لوگوں میں سے فاروق حیدر خان (جو عبوری طور جماعت کے صدر) اور شاہ غلام قادر (جو عبوری طور پر سیکریٹری جنرل) نامزد ہو گئے تھے، کے علاوہ میں واحد شخص تھا جس نے تقریر کی۔ اپنی تقریر میں مَیں نے جماعت کے آزاد کشمیر میں قیام کا خیر مقدم کیا اور اس کو آزاد کشمیر کی تاریخ میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ میاں صاحب مقبوضہ کشمیر کو ایک کشمیری پنڈت کے کشمیر کے ساتھ عشق نے ہندوستان کا اسیر بنایا، اب دوسرا کشمیری اس کو آزاد کروائے گا جس کی وجہ سے آپ کی سربراہی میں جماعت کا آزاد کشمیر میں قیام نیک شگون ہے۔ میں نے اپنے نظریے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم مملکت پاکستان کا حصہ ہیں اور جب مرکزی جماعتیں ادھر اپنی توسیع کرسکتی ہیں تو ہمارے مرکز تک پہنچنے میں کون سا امر مانع ہے؟ کشمیر کا مکمل فیصلہ ہونے تک کشمیر کے ان علاقوں کو قومی دھارے میں شامل ہونا مقبوضہ علاقوں کی آزادی کی ضامن بنے گا۔ میاں صاحب نے ان میں سے کسی نکتہ پر کوئی بات نہیں کی بلکہ ایم کیو ایم پر تنقید کی جس سے ملک بھر میں سیاسی ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ان کی مظفرآباد میں تقریر بے موقع اور بے محل تھی۔

اس کے بعد میں جماعت کے عام جلسوں میں اس طرح شامل نہیں ہوا جس طرح باقی سیاسی کارکن شامل ہوتے ہیں، لیکن مجھے 2011 کے اسمبلی الیکشن کے لیے منشور کمیٹی کے چیئرمین اور مرکزی مجلس عاملہ کا ممبر نامزد کر دیا گیا۔ منشور کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے میں نے اپنے نظریے کو مکمل طور پر سمو دیا اور اس میں لکھا کہ کشمیر کے مسئلہ کے متنازع حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے آزاد کشمیر کو 11 مئی 1971 کے حکومت پاکستان کے نوٹیفیکیشن کے مطابق وہ مقام دلانے کی کوشش کی جائے گی جو ملک کے باقی صوبوں کو حاصل ہے جس میں قومی اقتصادی کونسل، نیشنل فنانس کمیشن، کونسل آف کامن انٹرسٹ وغیرہ میں نمائندگی حاصل کرنا۔ یہی بات آزاد کشمیر کی لیگ کی لیڈرشپ بھی کر رہی ہے لیکن مختلف انداز

میں تا کہ ان کی بات سے قوم پرست یا نیشنلسٹ جماعتیں ناراض نہ ہوں۔ حالاں کہ پاکستانی جماعت کا آزاد کشمیر میں قیام اور اس کی لیڈرشپ کا آزاد کشمیر کے بارے میں فیصلہ کرنا، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ آزاد کشمیر بھی اسی طرح پاکستان کا حصہ ہے جس طرح باقی صوبے۔ مسلم لیگ کے مرکزی آئین میں آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کو الگ سے باقی صوبوں کے برابر صوبائی یونٹ کے برابر مقام دیا گیا ہے۔ پاکستان کے 2013 کے انتخابی منشور میں ان تمام وعدوں کا اعادہ کیا گیا ہے جو آزاد کشمیر کے 2011 کے الیکشن منشور میں درج ہیں۔ 2016 کا انتخابی منشور بھی میں نے ایک کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے تیار کیا جس میں واضح طور آزاد کشمیر کو صوبائی حقوق دینے کا اعادہ کیا ہے۔

مسلم لیگ کے آزاد کشمیر میں قیام اور 2011 کے الیکشن میں اس کی بارہ نشستوں پر کامیابی اس نوزائیدہ پارٹی کی بہت بڑی کامیابی تھی جس کا سہرا مرکزی قیادت کو جاتا ہے جس کے نام پر لوگوں نے ووٹ دیئے۔ اگر تین چار سیٹوں پر ٹکٹ کے غلط فیصلے نہ کیے گئے ہوتے تو لیگ کی آزاد کشمیر میں کم از کم پندرہ سیٹیں ہوتیں۔ شاہ غلام قادر کے نیلم حلقے سے الیکشن لڑنے سے راولپنڈی میں ہم نے تین سیٹیں ضائع کیں جبکہ چوتھی سیٹ نیلم کے حلقہ کی تھی۔ اگر اس حلقے میں لوکل امیدوار ہوتا تو صورتِ حال مختلف ہوتی گو کہ ہماری قیادت یہ ماننے کو تیار نہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔ اب شاہ غلام قادر نے نیلم میں اپنی پوزیشن مضبوط بنالی ہے۔ اور 2016 کے الیکشن میں 40 ہزار ریکارڈ ووٹ لے کر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

2011 کے الیکشن کے دوران میاں صاحب نے مجھ تک صدیق الفاروق کے ذریعے پیغام پہنچایا تھا کہ میں نے کسی حلقے سے ٹکٹ کی درخواست کیوں نہیں دی۔ اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ممبر شپ اور نمائندگی کے دیگر چینل بھی موجود ہیں جو میری شایانِ شان اور منصب کے پس منظر میں جچتے ہیں۔ مرکز میں مسلم لیگ کی حکومت بننے کے بعد میاں محمد نواز شریف کچھ باقی لوگوں کے علاوہ فاروق حیدر صاحب کو بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے کشمیر کونسل کا مشیر مقرر کرنا چاہتے ہیں لیکن میں کشمیر کونسل کا ممبر نہیں تھا، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا۔

2012 کے اوائل میں مسلم لیگ (ن) نے آزاد کشمیر کے پہلے جماعتی الیکشن میں مجھے چیف

الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا۔ میں نے معروف طریقے کے مطابق کارروائی شروع کی۔لیکن جماعت کی قیادت فاروق حیدر خان اور شاہ غلام قادر کو بالترتیب صدر اور جنرل سیکریٹری منتخب کروانا چاہتی تھی، اس لیے انہوں نے جنرل کونسل کے ممبران کی فہرست جاری ہی نہیں کی جو ان کے لیے نامزدگی کر سکتے تھے۔اس کو اس وقت جاری کیا گیا جب کاغذات نامزدگی داخل کروانے کا مرحلہ ختم ہو گیا، اس لیے انتخاب محض تین پوزیشن پر ہوا، صدر، سینئر نائب صدر اور سیکریٹری جنرل۔ ان تینوں نشستوں پر راجہ فاروق حیدر، چوہدری طارق فاروق اور شاہ غلام قادر منتخب قرار پائے۔ مجھے اس سلسلے میں کافی تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے خود بھی اس کا برا منایا کہ جو جماعتیں ملک کی جمہوری حکومت چلاتی ہیں، اگر ان کے اندر جمہوریت کے معروف اصولوں پر عمل نہیں ہو گا تو ملک بھر میں جمہوریت کس طرح چل سکے گی؟لیکن برصغیر کی سیاست کا رنگ روپ ہی خاندانی غلبہ پر مبنی ہے، وہ جو چاہیں وہی ہوتا ہے۔ پاکستان کے اندر اصل میں خاندانی غلبہ ہے اور خاندانی سیاسی جماعتیں ہیں۔ یہ زیادہ غالب ہیں۔ پاکستان کے آئین کے تحت جماعت کا سربراہ عملی طور پر ڈکٹیٹر ہوتا ہے۔ جماعت کے اندر اس کا فیصلہ حتمی اور اس کی مرضی کے خلاف عمل، جماعت، جماعتی عہدے اور اسمبلی کی ممبرشپ سے محرومی کے علاوہ کچھ نہیں۔ آزاد کشمیر کی صورتِ حال تو زیادہ ہی ابتر ہے۔ یہاں کی جماعتیں مرکز کی جماعتوں کی شاخیں ہیں اور ہر لحاظ سے ان کی مرہون منت ہیں بلکہ عملی طور پر گداگر ہیں۔ چوں کہ ان کا مرکز میں کسی جماعتی عہدے، حکومت سازی اور قانون سازی میں کوئی کردار نہیں ہے، اس لیے مرکز کی طرف سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہ خیرات ہے، حق نہیں۔ جب تک مرکز میں حکومت سازی۔ پالیسی سازی اور فیصلہ سازی میں آزاد کشمیر کے لوگ بطور ووٹر شامل نہیں ہوں گے، یہاں کی گداگری اور بے توقیری میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔اس حقیقت کا جتنا جلدی ادراک کیا جائے اچھا ہے۔

جماعت کا ابتدائی بلکہ بانی رکن ہونے کے باوجود مقامی لیڈرشپ مجھے ہر معاملے اور ہر لحاظ سے نظر انداز کرتی رہی۔ کسی جماعتی تقریب میں شرکت کے لیے کبھی اطلاع یا دعوت نہیں دی۔ کسی مشورے میں شامل نہیں کیا گیا۔حتیٰ کہ آئینی ترامیم کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی، اس میں میرے مشورے

کے بغیر کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا بلکہ ایسے خفیہ طریقے سے بے ڈھنگی تجاویز دی گئیں جو 2011 کے انتخابی منشور کے بھی خلاف تھیں۔ جماعت کے صدر کشمیر کونسل کو ختم کرنے کی ہر جگہ تقریر کرتے ہیں لیکن ان تجاویز میں اس کو چند ترامیم کے ساتھ بحال رکھنے کی سفارش کی ہے۔ مجھ سے پاکستانی سطح پر مرکزی منشور کمیٹی کے ایک اہم رکن نے پوچھا کہ کیا آپ کے فاروق حیدر کے ساتھ تعلقات خراب ہیں؟ میں نے کہا نہیں، کیوں؟ اس پر اس نے کہا کہ مرکزی منشور کمیٹی میں آزاد کشمیر کی نمائندگی کے لیے آپ کو کیوں نہیں تجویز کیا گیا جہاں پاکستان کے چوٹی کے اکابرین ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ اس کا جواب صدر جماعت ہی دے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں دانستہ نظر انداز کرنے کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ کہیں مرکزی نظر انتخاب مجھ پر نہ پڑ جائے اور یہ لوگ پیچھے رہ جائیں کیوں کہ یہاں پر تو وہی ہوتا ہے جو مرکزی قیادت چاہتی ہے۔

میدانِ عمل میں سیاست دان ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے باوجود کسی اور کو اس میدان میں آنے کے خلاف متحد ہوتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں ایک نامور سیاست دان اپنے ہم عصر دوسرے سیاست دان کی جان کے بھی مخالف تھے لیکن اس الیکشن میں اپنے مخالف کی حمایت کی۔ میں نے اس سے پوچھا آپ نے دشمن کی حمایت کیوں کی؟ اس نے جواب دیا، کسی تیسرے آدمی کے میدان میں آنے کی بجائے وہی ٹھیک تھا۔ حالاں کہ میرے عملی سیاست کے کوئی عزائم نہیں ہیں۔ مجھے دور رکھنے کی ایک اور وجہ آزاد کشمیر کو با اختیار بنانا، کشمیر کونسل اور مہاجرین نشستوں کو ختم کرنا، مرکزی اداروں میں نمائندگی دینے میں میرا جارحانہ موقف ہے جس کو عام لوگ بشمول فاروق حیدر پسند کرتے ہیں لیکن سیاست دان جب اقتدار میں ہوں، اس کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کا تذکرہ محض زیب داستان کے لیے کرتے ہیں۔ اس لیے مجھے دُور رکھنے کی ہی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں پاور بروکرز ناراض نہ ہو جائیں۔

سوائے سردار عبدالقیوم خان کے آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت کی یہ فطرت ہے کہ اپنے سے بہتر اہلیت یا شہرت کے حامل لوگوں کو آگے نہ آنے دیا جائے۔ حالاں کہ اس سے ان لوگوں کی عزت

میں اضافہ ہوتا کہ ان کے ساتھ ایسے لوگ بھی ہیں۔ سردار عبدالقیوم خان صاحب کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ ہر ایک کو اپنے ساتھ چلانے اور اپنے آپ کو منوانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ باقی سیاست دانوں کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ صرف وہ لوگ ہونے چاہئیں جو ان کی بات کے حق میں دلائل اور ان کی مرضی کے مطابق مشورہ دیں۔

مجموعی طور پر آزاد کشمیر میں مسلم لیگ (ن) کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ یہ ''راجوں'' کی جماعت ہے جو مسلم کانفرنس کا ناراض گروپ ہے۔ راجوں کی جماعت ہونے کا تاثر میرپور اور کوٹلی کے راجگان مقامی اور یورپ کی سطح پر پروان چڑھا رہے ہیں کیوں کہ مقامی طور پر ان کا مقابلہ جاٹوں اور گوجروں سے ہے۔ جاٹ اور گوجر تعلیمی، سیاسی اور معاشی طور پر اب راجگان پر سبقت لے رہے ہیں اور ان کا اثر ورسوخ بڑھ گیا ہے جس نے راجگان کے تاریخی دبدبے کو تحلیل کر دیا ہے۔ ان برادریوں کو نیچا دکھانے کے لیے سردار سکندر حیات خان کے بعد راجہ فاروق حیدر لیڈر کی صورت میں مل گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ صرف آزاد کشمیر بلکہ پورے پاکستان کی سیاست برادریوں کی زد میں ہے اور اسی بنیاد پر سیاسی حمایت یا مخالفت کی جاتی ہے۔ بہرحال آزاد کشمیر میں مستقبل مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کا ہی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیوں کہ مرکزی سطح پر یہی دو جماعتیں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ اللہ کرے ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ آزاد کشمیر و گلگت بلتستان کو کشمیر کی مکمل آزادی تک، عبوری طور پر آئین کے قومی دھارے میں شامل کیا جائے جس سے سمت کا تعین ہو جائے گا، وگرنہ یہاں کہ لوگوں کا نظریہ بدلتا رہے گا جو پاکستان اور کشمیریوں کے مفاد کے مغائر ہے۔ اب پاکستان تحریک انصاف بھی بیرسٹر سلطان محمود کے ذریعہ آزاد کشمیر میں ایک سیاسی اور پارلیمانی جماعت بن چکی ہے۔ گو کہ وہ خود الیکشن ہار گئے۔ اگر سابقہ جماعتوں نے آزاد کشمیر کو مقامی اور مرکزی سطح پر آئینی طور پر بااختیار اور باوقار بنانے کی کوشش نہ کی تو تحریک انصاف سبقت لے سکتی ہے۔